شعر و شعور

1970

بہ
حفیظ میرٹھی

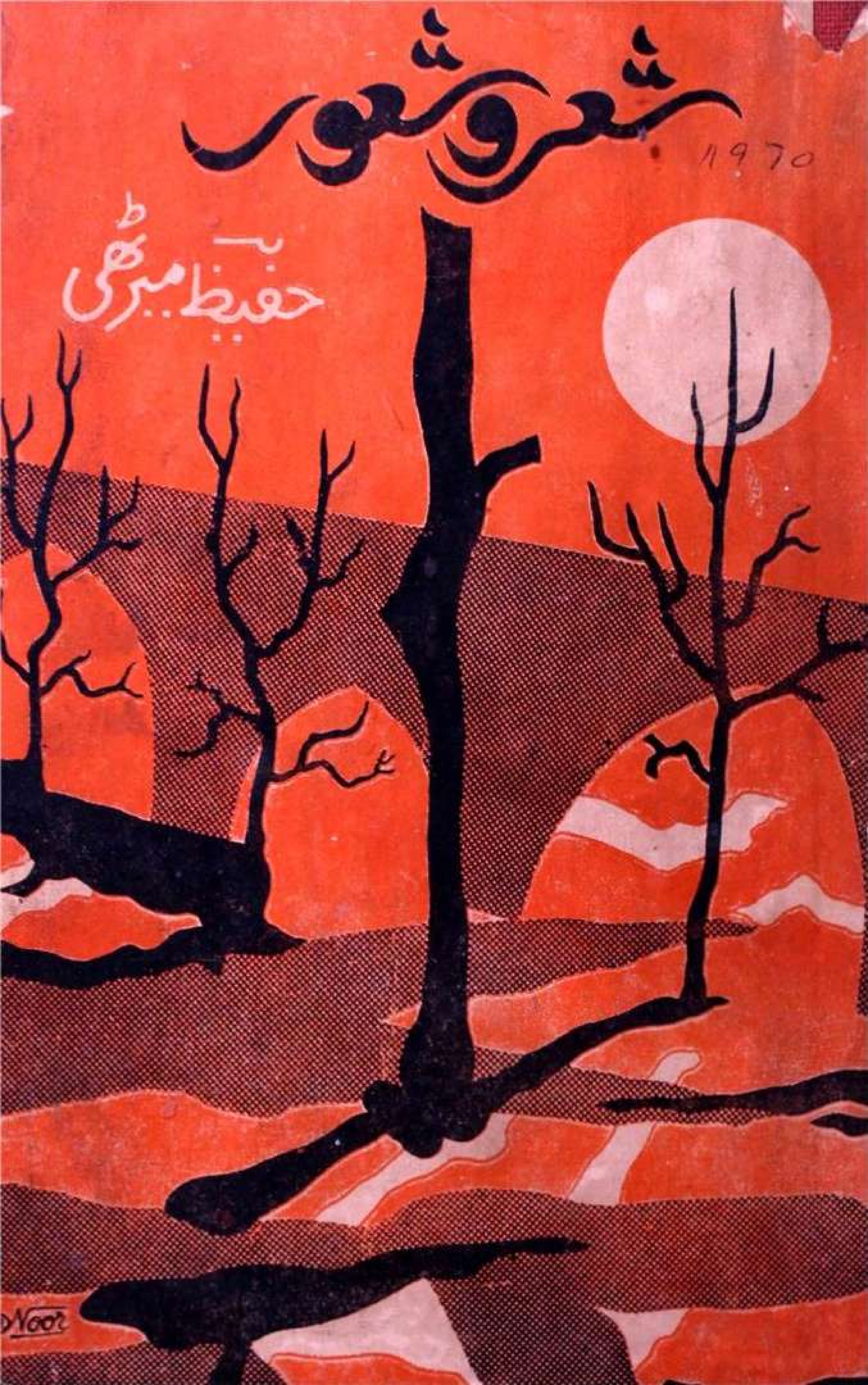

شعر و شعور

حفیظ میرٹھی

مکتبہ دوام ۔ ٹانڈہ (فیض آباد) یو، پی

بار اول ۱۰۰۰

قیمت : ۳ روپے

طابع و ناشر :

مکتبہ دوام

ٹانڈہ (فیض آباد)

مطبع :

نامی پریس لکھنؤ

وقت اشاعت :

مئی ۱۹۷۰ء

مطبع :

اس مجموعہ کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں

ادارۂ دوام

جناب عزیز بگھروی کا شکر گذار ہے

ادارۂ ادب اسلامی ہند

کی

چوتھی پیش کش

پیش لفظ

غزل اور مطالعۂ غزل کے سلسلے میں میں کچھ دنوں سے ایک خاص عقیدے کی پرورش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کی صد سالہ تقریبات کے ضمن میں غالب شناسی اور غالب پسندی کا جو غلغلہ بلند ہوا اس کے نفسیاتی اثرات کو بھی اس میں کچھ دخل ہو، لیکن بہر حال میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پچھلے سو سال کی اردو غزل کو اگر صحیح تناظر میں دیکھنا ہو تو غالب اور کلامِ غالب ہی کے زاویے سے دیکھنا ہو گا۔ کسی دوسرے مقام پر میں نے اس قضیے کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اردو کی روایتی غزل اپنی تمام کلاسیکی آن بان کے ساتھ غالب کی شاعری کے روپ میں اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہونچ گئی۔ اور اس کے بعد ذاتی خطوط پر اس کے مزید ارتقا کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ یوں گویا غالب نے اردو کی کلاسیکی غزل کا خاتمہ کر دیا۔ اور نتیجہ اس کا اس صورت میں سامنے آیا کہ وہ غزل جو کم و بیش دو سو سال تک ایک معین شاہراہ پر تابلِ تعریف استقامت اور یک سوئی کے ساتھ اپنا سفر جاری کیے رہی اور ارتقائی منازل کو بے گمان طے کرتی رہی تھی غالب کے بعد اس شاہراہ سے ہٹ کر چھوٹی موٹی پگڈنڈیوں پر جا پڑی اور جس طرح ایک خاندار و پر کیف دریا اپنے راستے میں کسی کوہِ گراں کو حائل پا کر متفرق دھاروں اور تنک آب ندیوں میں منقسم ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح غزل کا بنیادی کلاسیکی

اسلوب متفرق ضمنی اسلوبوں میں بٹ کر رہ گیا۔ تقسیم و تفریق کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ موجودہ دور میں تو اس کے اندر ایک غیر معمولی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ شکست و ریخت، ترمیم و تنسیخ، اور تخریب و انہدام کے سوا غزل کے میدان میں آج کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف انتشار کا دور دورہ ہے ایک بحران کا عالم ہے۔ اور کوئی مثبت و قیع اور بھاری بھر کم غزلیہ اسلوب ابھر کر سامنے نہیں آرہا ہے۔ اس تمام انتشار و بحران کو میری ناچیز رائے میں غالب اور اسکی ظالمانہ عظمت سے پیدا ہونیوالے امتناعی اثرات کی روشنی ہی میں بہترین طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

غزل تو ہماری شاعری کی سب سے مستحکم صنف ہے ـــــ اس کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی پشت پر صد ہا فن کاروں کی صناعانہ فتوحات اور گراں قدر تخلیقات کے طویل سلسلے ہیں جو ماضی میں دور تک چلے گئے ہیں۔ وہ اپنے بنیادی رمزیاتی اسلوب کی مداومت کے باوجود ہر دور میں، بلکہ ہر بڑے شاعر کے کلام میں ایک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بیان اظہار اور ابلاغ و ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار لطافتوں سے اس کا دامن لبریز ہے۔ افکار و تاملات، احساسات و انفعالات، حقائق و بصائر اور اسالیب و صور کے اس حیرت انگیز طلسم خانے کا جواب فارسی اور اردو کے علاوہ دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان اور شاید ہی کوئی دوسرا ادب ہو جو پیش کرنے کی جرات کر سکے ـــــــــــــــــــ پھر ایسی مستحکم صنف سخن کا اپنے محور سے ہٹ جانا، ادھر ادھر بھٹکنا اور ہاتھ ٹوئیاں مارنا کوئی ایسا سانحہ نہیں جسکو ہم وقت اور زمانے کے تغیرات سے منسوب کر کے مطمئن ہو جائیں۔ وقت اور زمانے کے تغیرات کوئی نئی چیز نہیں۔ ان سے تو غزل کو ہمیشہ ہی نصرت ملی اور غزل کا بنیادی اسلوب ان کی بنا پر کبھی تنزل نہیں ہوا۔ بات وہی ہے جو میں نے اوپر کہی۔ غالب نے روایتی غزل پر مہر اتمام ثبت کر دی، اور بعد میں آنے والے شعراء کے لیے یہ راستہ مسدود ہو گیا۔ چنانچہ داغ، امیر، جلال اور ان کے ہم نواؤں کا دور غزل کے ضعف پیری کا دور تھا، اور حسرت، اصغر، فانی اور جگر کا زمانہ اس مریض جاں بلب کا آخری سنبھالا، جس کے بعد یہ شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

پھر جب میں یہ کہتا ہوں کہ غالب نے اردو کی کلاسیکی غزل کو نصف النہار پر پہنچا کر اس کے مزید نشوونما کے امکانات کو ختم کر دیا، اور آخری ردِ عمل اس کا یہ تھا کہ صنفِ غزل ہی کا خاتمہ ہو گیا، تو دراصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سراج و ولی اور میر و سودا سے لے کر غالب تک غزل جس روایتی بنیادی و اساسی اور معلوم و معروف اسلوب کے سہارے آگے بڑھتی رہی تھی اس اسلوب کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ نکلتا ہے کہ غزل کا مخصوص رمزیاتی پیرایۂ بیان جو معین و مخصوص علائم و اشارات اور تمثیلات و مجازات پر مبنی تھا قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا۔ اور وہ تمام فکری و معنوی دلالتیں اور تخیلی و تصوری تلازمات جو ان مخصوص علائم سے وابستہ تھے آئندہ کے لیے بے مصرف و ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے غزل گو شعرا ان اگلے ہوئے نوالوں کو چباتے رہے اور اس مردہ نظامِ علائم کی ہڈیوں سے اپنی دوکان کو سجانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہے۔ پھر اصغر و فانی نے اپنے رچے ہوئے کلاسیکی مزاجِ شعری کی بدولت غزل کی قدیم فرسودہ علامتوں میں ذاتی تخیلی و جمالی تجربات کا رنگ بھرا اور کچھ دنوں ہی کے لیے سہی، ان میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس کو غزل کی نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا، لیکن اس کی حیثیت اس الکلیشن سے زیادہ نہیں تھی جو کسی مرنے والے کی موت کو چند ساعتوں کے لیے ملتوی کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ قصہ مختصر یہ کہ کلاسیکی غزل کے کلاسیکی اسلوب کا قصہ تمام ہوا۔ اس کے انتزاع کا عمل غالب کے بعد شروع ہوا اور حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے ساتھ اختتام کو پہنچا!

اب اس کے بعد غزل سراؤں یا غزل سرائی کا حوصلہ رکھنے والوں کے لئے صرف دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل کی روایت کے بنیادی عناصر و اجزا کی طرف سے یکسر منہ موڑ لیں اور روایتی علائم و رموز کو پس پشت ڈال کر شعر کہیں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی خلاقانہ قوت سے کام لے کر قدیم علامتوں کو نئے مطالب اور نئے مفاہیم کے اظہار کا ذریعہ بنائیں، اور اس طور پر غزل کی روایت کی از سرِ نو بحالی اور آبادکاری کا فریضہ انجام دیں۔ یہ کہنے کی ضرورت

نہیں کہ پہلے اکبر نے اور پھر اقبال نے یہی مذکورۂ بالا روش اپنائی تھی اور متداول علامتوں کو نئے معانی پہنا کر اور نئے تصورات سے آباد کر کے اپنا اپنا مخصوص اور جداگانہ ایمائی نظام قائم کیا تھا جس کو وہ خود تو بڑی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ برت گئے، لیکن ان کے بعد ان اکتسابات کو آگے بڑھانے اور ان کو ایک مستقل روایت میں تبدیل کرنے کا عمل جاری نہیں رہ سکا۔ عمرانی و تہذیبی تصورات اور فلسفیانہ افکار کو جمالیاتی تجربات میں ڈھالنا اور ذوقی و وجدانی واردات کا روپ عطا کرنا معمولی فن کاروں کا کام نہیں، اور اکبر و اقبال جیسے فن کار مہیا کرنے کے معاملے میں فطرت بہت بخیل واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں شاعر اپنے اپنے رنگ کے موجد و خاتم قرار پائے۔ ظفر علیخاں، محمد علی جوہر کی غزلوں میں بھی کسی حد تک اس روش اور کوشش کا ثبوت ملتا ہے۔ ان دونوں نے بھی غزل کے روایتی علائم کے ذریعے اپنے زمانے کے سیاسی افکار کی ترجمانی کی۔ جوش کی مسلسل غزلوں کو دیکھئے تو وہاں بھی اس عمل کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ اور پھر جوش ہی کے زمانے میں ترقی پسند شاعروں نے بھی اپنے ترقی پسندانہ فکری میلانات کو جب اور جہاں بھی غزلوں میں پیش کیا اسی ٹکنیک کا سہارا لیا، جس میں ان کو انفرادی شعراء کی انفرادی صلاحیتوں کے اعتبار سے کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی نہیں۔ اس جائزے کی روشنی میں اگر کوئی مثبت نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو یہی کہ موجودہ دور میں غزل کے نظام کو کامیابی کے ساتھ برتنے کی تنہا صورت یہ ہے کہ پرانی علامتوں کو نئی فکری دلالتوں سے وابستہ کیا جائے اور پرانے استعاروں کی مدد سے نئے ذہنی پیکروں کی تخلیق عمل میں لائی جائے۔ اب رہی وہ دوسری روش جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا یعنی یہ کہ غزل کے سارے روایتی ساز و سامان سے یک قلم منہ موڑ لیا جائے اور عریاں حقائق کو عریاں الفاظ میں براہِ راست اور واشگاف طور پر پیش کیا جائے، تو اس راستے کی دشواریاں اور قباحتیں ظاہر ہیں۔ اول تو اس روش کی پیروی میں جو غزل سرانجام کی جائے گی وہ محض نام کی غزل ہوگی۔ غزل کی روایت سے اس کا تعلق صرف ظاہری ہیئت کی حد تک ہوگا۔ غزل کی ایمائیت اس میں مفقود ہوگی۔ اس کا اسلوب بنیادی طور پر نظم کا اسلوب ہوگا، اور غزلیہ اسلوب کی تصویر کشی

سے محروم ہونے کے باعث اس کا دائرہ فکر و تصور بہت محدود ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اس غزل میں کامیابی کی ضامن اگر کوئی چیز ہوگی تو وہ حقائق کے ضمن میں شاعر کی شفاف بصیرت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی، اور تخلیقی آرٹ کی دنیا میں یہ ایسی کڑی شرط ہے جس کو قدر اول کے بھی سب شاعر پورا نہیں کر سکتے۔ حاصل کلام یہ کہ موجودہ دور میں اگر غزل کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور آبرومندانہ طور پر باقی رکھا جا سکتا ہے تو اس کی وہ صورت نہ ہوگی جو اس دور میں اکثر غزل نگاروں کے کلام میں نظر آتی ہے کہ انھوں نے غزل کے روایتی اسلوب و طریق کار سے مکمل علیحدگی اختیار کر کے متفرق نظمیہ مضامین کو غزل کے پیرائے میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور نتیجہ "غزل نہیں" غزل سے ملتی جلتی کوئی غیر مشخص چیز وجود میں آ رہی ہے اور رسائل کے ذریعے اشاعت پذیر ہو کر شعر و شاعری کی دنیا سے ادبی و فنی حظ کے عنصر کو خارج کر دینے کے سوا کوئی دوسرا کارنامہ انجام دیتی ہوئی نظر نہیں آتی !

میری ان معروضات کی روشنی میں پچھلے سو سال کی اردو غزل کا جائزہ لیا جائے اور اس امر کی تصدیق کی جائے ——— کہ ——— غزل کی بقا کا سامان نہ تو وہ شعرا کر سکے جو کلاسیکی غزل کے مردے کو پیٹتے رہے، اور نہ وہ جنھوں نے غزل کے داخلی و خارجی لوازمات میں صرف اس کی خارجی ہیئت (مطلع، مقطع اور بے ربطیٔ اشعار) کو قابلِ اعتنا سمجھا اور باقی ہر چیز کو متروک یا مردود خیال کیا۔ گویا غزل کی ہڈیاں لے لیں اور گوشت پوست کو بالکل چھوڑ دیا۔ کسی قدر مختلف الفاظ میں اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غزل کو زندہ رکھنے کا اہتمام نہ تو "متعصبین" کر سکے نہ "تحریف پسند"۔ یہ کام تو کچھ انہیں لوگوں سے ان پڑا جن کا رویہ اس خصوص میں معتدل اور حرکی تھا۔ جنھوں نے کلاسیکی غزل کے بہترین عناصر کو اپنے فن میں جذب کیا، فرسودہ علائم کو چھوڑا، مفید و جاندار علامتوں میں ذاتی تجربات اور عصری میلانات کو سمویا، اور بالآخر غزل کو غزل کی تمام شیوہ بیانیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ قائم رکھتے ہوئے لے کے اپنے عہد کی ایک توانا صنفِ شعر بنانے میں کامیاب ہوئے۔

موجودہ دور کے جن غزل نگار شعرا کے کلام میں اس مسلک کی پیروی نظر آتی ہے ان میں جناب حفیظ میرٹھی بھی ہیں جن کی غزلیات کا مجموعہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ ان کے کلام پر ایک سرسری اور عمومی نظر ڈالتے ہی مجھے ان خصوصیات و اوصاف کا احساس ہوا جن کا ذکر غزل کے نقادوں اور مجموعہ ہائے غزل کے مقدمہ نگاروں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ میرا اشارہ ان روایتی شعری محاسن کی طرف ہے جن کو ایک مدت تک غزل کی کسوٹی سمجھا جاتا رہا اور جن کی روشنی میں غزل نگاروں کی قدر و قیمت اور رتبہ و منصب کا تعین ہوتا رہا۔ وہ شعری محاسن ہیں: زبان کی روانی، روزمرہ کی صفائی، مصرعوں کی برجستگی، بندش کی چستی، شستگی و رفتگی بے ساختگی، شیرینی و فصاحت، بے تکلفی، لطافتِ خیال، حسنِ بیان، نزاکتِ تخیل، صداقتِ جذبات، اثر آفرینی، وجد انگیزی، جدت طرازی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے حفیظ صاحب کے کلام میں ان چیزوں میں سے بعض یا اکثر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ لیکن میں اتنا کہہ دینا ہی کافی سمجھتا ہوں۔ ان محاسن کا تفصیلی تذکرہ یا حفیظ صاحب کے کلام میں انکی موجودگی کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش میرے نزدیک ایک بے معنی کوشش ہوگی۔ اس لئے کہ اگر کسی غزل گو شاعر کا کلام ان اوصاف سے عاری ہو تو اسکو غزل گو ہی کیوں کہا جائے اور اس کے کلام کو غزل کے زمرے میں شمار ہی کیوں کیا جائے؟ مطلب یہ کہ کسی شاعر کو ایک اچھا یا کامیاب یا قابل ذکر غزل گو کہنا ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کے کلام میں یہ سب اوصاف کسی نہ کسی حد تک ضرور پائے جاتے ہیں۔ دیکھنے اور جاننے کی چیز یہ ہے کہ شاعر نے فکر کی کس سطح پر شاعری کی ہے؟ اس کے بنیادی فکری میلانات کس نوعیت کے ہیں؟ اسکے افکار کا طول و عرض اور وزن و عمق کیا ہے؟ اس نے وقت کے تقاضوں کو کس حد تک اپنے کلام میں سمویا ہے؟ وہ روحِ عصر کو اپنے دل کی دھڑکن بنانے میں اور عصری شعور کو اپنے لاشعوری نفس کی لیبارٹری میں تقطیر و کشید کے عمل سے گزارنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ وہ اپنے عہد کی بصیرتوں کو کس حد تک ذاتی بصیرتوں میں تبدیل کر سکا ہے؟ اپنے دور کی بنیادی قدروں پر اس کی

ذہنی گرفت کا کیا عالم ہے؟ فن کے تقاضوں کی پاس داری اس کے یہاں کتنی ہوئی ہے؟ فن اور مقصد کے امتزاج میں اسکی کامیابی کا اوسط کیا ہے؟ پھر یہ کہ غزل گو کی حیثیت سے غزلیہ اسلوب کی جانب اس کا مجموعی رویہ کس قسم کا ہے؟ اس نے غزل کی روایت کے جاندار عناصر کو جذب کیا ہے یا نہیں؟ غزل کی رمزیت اور ایمائیت کو اس نے کس طور سے برتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالوں کے جواب اگر حفیظ صاحب کے کلام میں ڈھونڈے جائیں تو میرے خیال میں یہ جستجو بے نتیجہ ثابت نہیں ہوگی۔ اتنا تو بالکل ظاہر ہے کہ غزل کی طرف حفیظ صاحب کا رویہ ایک تخلیقی اور متحرک رویہ ہے۔ وہ نہ تو پرانے رسم پرست شاعروں کی آواز میں آواز ملا کر محض نقالی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور نہ دوسری انتہا پر پہنچ کر صنف غزل کو اسکی صنفی آرائش و زیبائش سے عاری کر کے ایک بے جان و بے آب و رنگ ڈھانچہ ہی بنا ڈالنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ انکے یہاں غزل کی روایت کی پاسداری بھی ہے اور غزل کے فنی لوازم کا احترام بھی۔ غزل کے رموز و علائم کو انھوں نے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ بہت سی علامتوں کو ان کے فرسودہ بے جان متعلقات کے ساتھ ترک کر دیا ہے، مفید و کارآمد علامتوں کے امکانات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور تقریباً ہر جگہ تخیل اور جذبے کی خلاقانہ قوت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ خارجی حقائق اور ادی مسائلِ حیات کی طرف سے بھی وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کے ٹھوس کو الف سے نبرد آزما ہونے کی ایک شدید کوشش نظر آتی ہے۔ اور زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس جذبِ جمیل میں نازک ترین مقام آتا ہے اور جس سے صحیح سلامت گزرنا کسی ہمالیائی مہم کو سر کرنے سے ہرگز کم نہیں یعنی غنائیت اور مقصدیت کا کامیاب امتزاج، تو اس سلسلے میں حفیظ صاحب ہر جگہ نہیں تو اکثر مقامات پر قابل تعریف کارکردگی کا ثبوت دیتے ہیں، اور بہرحال مایوس نہیں کرتے۔ اس ضمن میں ان کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

کھلی رہنمائیاں ہیں کھلی ناخدائیاں ہیں
وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

رعنائی افکار و خیالات کا مطلب
عریانی افکار و خیالات نہیں ہے

اب کھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دور اشارات و کنایات نہیں ہے

کبھی ایسی بھی رت لائیگی فطرت باغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غزلیہ شاعری کا یہ خاص رنگ آسانی کے ساتھ اپنی جھلک نہیں دکھاتا یہ دراصل آمیزہ ہے فکریت، حرکیت اور اجتماعیت کا، اور کوئی سہل الحصول چیز نہیں۔ اس کے لئے بڑی جانکاہ محنت درکار ہوتی ہے اور اس کو اپنا مطمحِ نظر بنانا عمر بھر کی فنی ریاضت کی ذمہ داری اپنے سر لینا ہے۔ بلاشبہ حفیظ صاحب کو منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے ابھی ایک طویل مسافت طے کرنی ہے۔

اس مخصوص رنگ کے اشعار سے ہٹ کر بھی حفیظ صاحب کے کلام میں غایتی میلان اور اجتماعی احساس کی ایک زیریں رو ملتی ہے جس سے ان کے یہاں فکری وزن بھی پیدا ہوتا ہے، اور اس خیال کی مزید توثیق بھی کہ اچھی شاعری کو اسلوب کے لحاظ سے انفرادی مگر مواد کے اعتبار سے بہرحال اجتماعی ہونا چاہئیے۔ اس امر کی وضاحت کے لئے زیرِ نظر مجموعے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جمودِ زندگی میں بے پیے جینا بھی مشکل تھا
جہادِ زندگی میں یاد مے خانے نہیں آئے

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

غایتی میلان کی اس زیریں رو سے بھی قطعِ نظر کیجئے تو حفیظ صاحب کے یہاں جگہ جگہ ایک والہانہ جوش اور ایک سرمستانہ کیفیت ملتی ہے جو ان کے غایتی میلان کے منافی بھی نہیں اور کلام کی فنی سطح کو بھی اوپر اٹھاتی ہے، اور بہرحال جمالیاتی حظ کا سامان بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں غزل کی صنف کو اپنانا، اور مقبولیت و معنویت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزل سرائی کا تہیہ کرنا ہی کیسی کچھ جگرداری کا کام ہے، پھر اسمیں فکری و نظریاتی شعور کی ترجمانی کا اضافہ اس راستے کو جتنا دشوار گزار بنا دیتا ہے اس کا تصور بھی شاید ہر شخص کیلئے ممکن نہ ہو۔ کسی چٹان کو کاٹ کر چشمۂ آب برآمد کرنا جتنا مشکل ہو سکتا ہے کچھ اسی سے کم اتنا مشکل تو یہ کام ہے ہی۔

حفیظ صاحب نئی غزل گوئی کے اسی راستے پر گامزن ہیں۔ ان کے اس عزم کی بنا پر اور اس سعی و تردد کے پیشِ نظر جس کا وہ ابتک ثبوت دے چکے ہیں میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ انکو غزل گوئی کی اجازت دی جاسکتی ہے!

—— اختر انصاری دہلوی
علیگڑھ، یکم اپریل ۱۹۷۰ء

حفیظ میرٹھی کی شاعری

سنہ ۳۶ء سے پہلے اردو ادب میں تنظیم اور جماعت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ادب کا دھارا اپنی فطری رفتار سے بہہ رہا تھا اور بغیر کسی جماعت بندی کے قرار ادب میں ایک سے ایک موتی اپنے اپنے صدف میں پل کر سماج کی سطح پر ابھر رہے تھے۔ لیکن سنہ ۳۶ء میں اشتراکیت نوازوں نے ترقی پسندی کے عنوان سے ایک باضابطہ تنظیم بنا ڈالی، جو آگے چل کر اتنی ضابطہ بند ہو گئی کہ اس نے ان تمام ادیبوں کو اپنی دفتری فہرست سے خارج کر دیا جن کے بارے میں یہ شبہ کیا گیا کہ وہ اشتراکیت نواز نہیں ہیں، حالانکہ یہ لوگ ترقی پسند ادب، کو پروان چڑھانے والوں میں تھے اور ادب میں اپنا ایک ممتاز مقام بنا چکے تھے۔ ادب میں اشتراکی دھول دھپے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر ترقی پسند تحریک خود ہی پارہ پارہ ہو گئی اور بہ حیثیت مجموعی اس نے ادب میں بعض مریضانہ رجحانات اور نتیجتہً زوال و انتشار کے عناصر کو فروغ دیا۔

یہی وہ فضا تھی جس میں "ادارۂ ادب اسلامی" کی داغ بیل ڈالی گئی، جس کا بینہ مقصد اردو ادب میں اس توازن کو بحال کرنا تھا جسے ہنگامہ ترقی پسندی نے بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اسلامی نے ادب میں خالی ترقی پسندی کی بجائے تعمیر پسندی کا نعرہ دیا اور اپنا مطمح نظر صحت مند، صالح اور توانا قدروں کا فروغ قرار دیا۔ ادارۂ ادب اسلامی کا یہ نصب العین دانش وروں کے ایک حلقے میں کافی مقبول ہوا اور اس کے تحت مختلف اصناف ادب میں کئی اہم تخلیقات پیش کی گئیں اور چند افراد نمایاں ہوئے۔ چنانچہ اس وقت اسلامی نصب العین سے وابستہ ادبا و شعرا کا ایک کارواں اردو ادب میں پایا جاتا ہے۔ اس کارواں میں ایک صف شاعری کی ہے جو دوسری صنفوں سے کچھ زیادہ بارونق نظر آتی ہے۔

حفیظ میرٹھی ہندوستان کے اسلام پسند شعرا کی اس صف میں ممتاز ترین مقام کے حامل ہیں۔ یہ مقام

انہوں نے اپنے فنی ریاض اور شخصی خونِ جگر سے حاصل کیا ہے۔ بلاشبہ اس ریاض اور خونِ جگر پر انہیں ان کے نظریے اور فکر نے ابھارا ہوگا، مگر یہ شاعرانہ اوصاف انفرادی طور پر حفیظ کے اپنے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ سواتی کی بوندیں سطحِ دریا پر بہ طورِ عام گرتی ہیں، لیکن موتی بننا اسی قطرے کو نصیب ہوتا ہے جس کی پرورش کوئی صدف اپنے آغوشِ خاص میں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں حفیظ کو ان شاعروں میں سمجھتا ہوں جن کی تربیت خواہ کسی مخصوص حلقے میں ہوئی ہو مگر اپنے حسنِ کلام کی بدولت وہ ادب کے دائرہ عام میں اپنے لئے ایک جگہ بنا لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات ایک شاعر کی ممکنہ عظمت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب تک فکرِ خاص عمومِ فن نہ حاصل کر لے فن کے دائرے میں اس کا اعتبار نہیں قائم ہوتا۔ چنانچہ یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ حفیظ کی اسلامی فکر فنِ شاعری کا رسوخ حاصل کر چکی ہے اور اس طرح وہ تحریکِ اسلامی سے وابستہ ان محدودے چند افراد میں ایک ہیں جو اردو کی مسلمہ ادبی روایت کے ایک جز بن سکتے ہیں اور تاریخِ ادب میں اپنے آپ کو شخصاً درج کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مطلب یہ کہ شعرا کے ہجوم میں حفیظ کی اپنی آواز پہچانی جا سکتی ہے، خواہ اس کے سُر ابھی کتنے ہی ہلکے ہوں، اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ زیادہ سے زیادہ گونج دار ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں، یہ دکھلانے کے لئے کہ حفیظ ان قافیہ پیماؤں میں نہیں ہیں جو پورے پورے دیوان میں محض ایک دو شعر رواں نکال کر شاعر بن جاتے ہیں، اردو زبان کی سلاست اور اردو شاعری کے عام اسلوب کی پختگی کے بل پر، بلکہ حفیظ کا اپنا ہی جذبۂ شعری اور اظہارِ بیان اتنا بالغ و راسخ ہو چکا ہے کہ ایک پوری غزل اور قدرے طویل غزل میں عمومی طور پر یہ جذبۂ اظہار یعنی حسنِ تخیل و حسنِ بیان، ہمواری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔

چاہے تن من سب جل جائے　　سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے　　دل ٹوٹے آواز نہ آئے
بحرِ محبت توبہ توبہ　　تیرا جائے نہ ڈوبا جائے
اے وائے مجبوریٔ انساں　　کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی گاتا جائے روتا جائے
دنیا کا اپنا ناہی کیا کانٹے اپنے پھول پرائے
عزت و دولت آنی جانی رل مل جائے چھن چھن جائے
ظرف ہے یہ تو اپنا اپنا کوئی بگاڑے کوئی بنائے
جس کو ہو کہنی دل کی کہانی سرتاپا دھڑکن بن جائے

کاش ہمارا فرض محبت
عیش محبت پہ چھا جائے

بلاشبہ اس غزل کا غنائی آہنگ جگر مرادآبادی کی یاد دلاتا ہے، لیکن اس میں صرف جگر کی مستی و طرب ناکی نہیں ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعر میں کوئی نکتۂ فکر ہے، اسکے علاوہ لہجے میں ایک ٹھہراؤ اور انداز میں ایک فقیرانہ دردمندی ہے اور یہ سب باتیں اگر جگر اسکول کے خانے میں بھی رکھ کر دیکھا جائے، تو حفیظ کو ایک منفرد شاعر بنانے کا سامان رکھتی ہیں، اس لئے کہ عرفانِ حقیقت سے بہرہ ور ہو جانے کے باوجود جگر کے فن میں ان باتوں کی حیثیت ثانوی ہے، جب کہ حفیظ کا اصل سرمایہ یہی باتیں ہیں۔ حفیظ کی شاعری میں ان باتوں کی ہمہ گیر اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں ان کی دوسری غزلوں کے کچھ منتخب اشعار دیئے جاتے ہیں

حیات و موت کرشمے ہیں انکی شوخی کے کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے
اب اپنے جیب و گریباں کا کیا سوال رہا جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی
اس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے جو عزم کہ پروردۂ آفات نہیں ہے
ہاتھ آگئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا اس آستاں کو خاک کے ذرے کہاں ملے
آئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

حفیظ ہی کا ایک مصرعہ مستعار لے کر کہنا چاہیئے کہ ان اشعار میں "شگفتگی بھی ہے

تاثیر بھی، بصیرت بھی۔" اور آج کی غزل گوئی میں یہ اوصاف اگر کسی شاعر کو میسر آ گئے ہیں تو اسے یہ حق پہونچتا ہے کہ اپنی تخلیقات کا حجم معتد بہ حد تک بڑھا کر دورِ حاضر کے تغزل کی ایک مستند آواز بن جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک عرصہ کی زمزمہ پردازی کے بعد بھی حفیظ غالباً اپنی شاعری کے اس منصب کی طرف بہت کم توجہ کر سکے ہیں کہ اسے موجودہ اردو غزل گوئی میں ایک قوت بنانے کی ضرورت ہے، تاکہ عدمِ تغزل کی جو لہریں خود غزل کے اندر چلائی جا رہی ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ محدود اور بے اثر بنایا جا سکے اور ان کے مقابلے میں مثبت طور پر تغزل کی فنی روایت میں زیادہ سے زیادہ توسیع ہوتی رہے۔ میں نے جو ایک پوری غزل پیش کی ہے اس کا موازنہ اگر فراق کی متغزلانہ طول نویسی سے کیا جائے تو غزل گوئی میں حفیظ کی قوت و صلاحیت کا کچھ اندازہ بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ فراق اپنے کڈھب اسلوب میں جن نفسی کوائف کی آئینہ داری بار بار کرتے ہیں حفیظ اُسے پسند بھی نہ کریں گے، اس لئے کہ دوسروں کی خلوتوں میں جھانکنا اور اپنی خلوتوں کو رسوا کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں، مگر طول بیانی کے باوصف ایک تو حفیظ کے ہر شعر میں کچھ گفتنی ہے، دوسرے ان کے اظہار و بیان میں کہیں ژولیدگی اور کوتاہی نہیں۔ میں نے فراق کے ساتھ یہ موازنہ خاص کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا ہے کہ آج "جدید" غزل گویوں کی ایک کھیپ فراق زدہ ہو کر اردو غزل میں عجیب عجیب کوبڑ نکال رہی ہے اور حفیظ کا کنفرنٹیشن اس وقت اسی کھیپ سے ہے، اور اس کھیپ کے مقابلے میں حفیظ کے فنی اسلحے زیادہ چابک دست اور کاری ہیں، اگر وہ ان اسلحوں کا بھرپور استعمال کر سکیں۔

اس طرح میرے نزدیک حفیظ میرٹھی کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ وہ محض کسی ادارۂ ادب کے شاعر نہیں ہیں، بلکہ ادب کے شاعر ہیں اور اس لحاظ سے انہوں نے اپنے ادارے کا بھی ادبی اعتبار بڑھایا ہے، اور دوسری طرف اپنے ادبی موقف اور فنی صلاحیت کے سبب وہ دورِ جدید میں اردو غزل کی روایت کو اپنے عہد کے بعض دوسرے شعرا کے ساتھ مل کر سنبھالنے اور بڑھانے کا پورا سروسامان رکھتے ہیں۔

عبد المغنی   ۱۳ر جنوری [illegible]

نعت

میسر ہو اگر ایمانِ کامل
کہاں کی الجھنیں، کیسے مسائل

نہیں جن میں تمہارا عکس شامل
وہ نقشے ہیں مٹا دینے کے قابل

ثبوتِ عظمتِ انسانیت ہیں
محمدؐ مصطفےٰ انسان کامل

تمہارا ہر قدم شمعِ ہدایت
تمہارا نقش پا تصویرِ منزل

ہزار آزادیوں سے لاکھ بہتر
تمہارے عشق کے طوق و سلاسل

تمہارے قولِ فیصل سے ہوئی ہے
نمایاں خیر و شر کی حدِّ فاصل

سکوں مجھ کو نہیں درکار آقا
بڑھا دیجے مری بے تابیٔ دل

اجازت ہو تو شاہا! پیش کر دوں
مرے پہلو میں ہے ٹوٹا ہوا دل

حفیظ اس عشقِ احمدؐ کی بدولت
مجھے ہے دولتِ کونین حاصل

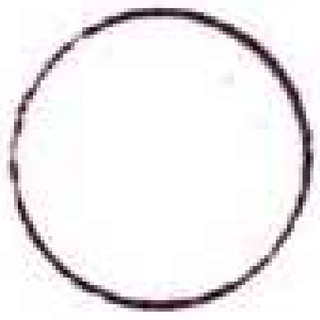

چاہے تن من سب جل جائے

سوزِ دروں پر آنچ نہ آئے

شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے

دل ٹوٹے آواز نہ آئے

بحرِ محبت توبہ توبہ !

تیرا جائے نہ ڈوبا جائے

اے دائے مجبوری انساں

کیا سوچے اور کیا ہو جائے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنّی

گاتا جائے روتا جائے

دنیا کا اپنانا ہی کیا!

کانٹے اپنے پھول پرائے

عزت دولت آنی جانی

مِل مِل جائے چھِن چھِن جائے

ظرف ہے یہ تو اپنا اپنا

کوئی بگاڑے کوئی بنائے

جس کو ہو کہنی دل کی کہانی

سرتاپا دھڑکن بن جائے

کاش ہمارا فرضِ محبت

عیشِ محبت پر چھا جائے

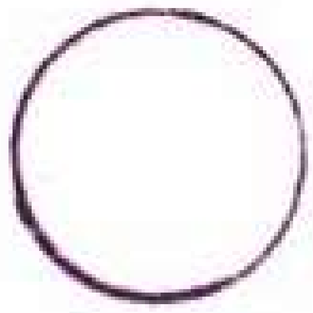

ہر سکوں کی تہ میں سو آتش فشاں رکھتا ہوں میں
ضبط کا اک رخ نمایاں اک نہاں رکھتا ہوں میں

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

ہائے رے نیرنگیاں ہوں تو چراغ اب بھی مگر
روشنی رکھتا تھا پہلے اب دھواں رکھتا ہوں میں

آج تک گذری اجل کی آرزو میں زندگی
زندگی سے آج بھی دلچسپیاں رکھتا ہوں میں

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیاں و گلستاں
آدمی ہوں، عزمِ تعمیرِ جہاں رکھتا ہوں میں

مجھ سے کب ہوتی بھلا پابندیِ رسمِ وجود
ان کی دلداری کی خاطر جسم و جاں رکھتا ہوں میں

اب بھی وہ اپنا سمجھ کر مجھ کو اپنا لیں حفیظؔ
کون جانے ورنہ پھر یہ سر کہاں رکھتا ہوں میں

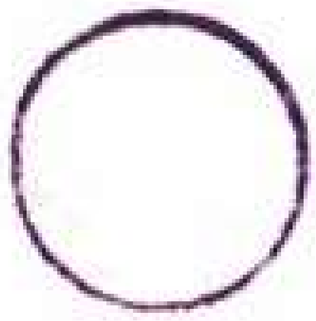

نہ شوخیوں سے نہ سنجیدگی سے ملتی ہیں
وہ لذتیں جو تری برہمی سے ملتی ہیں

جب اس کے غم کے سوا زیست کچھ نہیں ہوتی
وہ ساعتیں بڑی خوش قسمتی سے ملتی ہیں

نہیں ضرور کہ قربت ہو وصل کا حاصل
کہ دوریاں بھی تو وابستگی سے ملتی ہیں

اگرچہ ترکِ تعلق کو ایک عمر ہوئی
وہ نظریں اب بھی اسی دلکشی سے ملتی ہیں

دلِ تباہ! مری بات کا خیال نہ کر!
ملامتیں بھی تو ہمدرد ہی سے ملتی ہیں!

نقابِ حسن کو جلووں سے مختلف نہ سمجھ
نظر کو دید کی راہیں اسی سے ملتی ہیں

جو درد و غم کی طلب ہے سنو کلامِ حفیظ
یہ بخششیں کسی محروم ہی سے ملتی ہیں

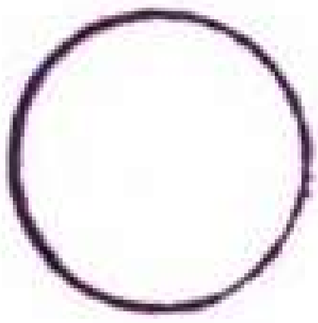

کس کس انداز سے فطرت نے مجھے خوار کیا
کہیں مجبور بنایا کہیں مختار کیا

نیم باز آنکھوں سے یہ کیا نگہ یار کیا
نہ تو معصوم ہی چھوڑا نہ گنہگار کیا

میں تو اس درد کے انجام سے تھرّاتا تھا
جس کے آغاز نے تم کو مرا غمخوار کیا!

ہائے مجبوری الفت کہ بایں سوز و گداز
ہم نے ہنس ہنس کے ترے عشق سے انکار کیا

وہی دیوانہ سا بربادسا شاعر سا حفیظ
تم نے بھی کس کے لیے دل کو گرانبار کیا

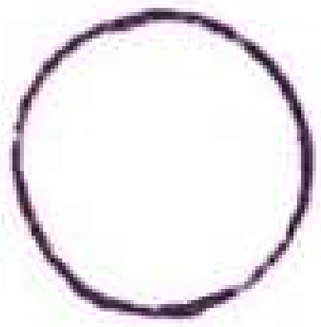

بجھا بجھا غمِ پنہاں سے وہ شباب رہا
اک آفتاب پسِ پردۂ سحاب رہا

دھڑکتے دل کی قسم آپ کے نہ آنے سے
تمام رات ستاروں کو اضطراب رہا

انھیں بھلا کے تو کچھ اور ہو گئے برباد
ہوا سکوں ہی میسّر نہ اضطراب رہا

زباں تو پھر بھی زباں ہے نگاہ تک نہ اٹھی
مگر وہ شکوہ کہ اس پر بھی کامیاب رہا

شروعِ عشق کی ناکامیاں ارے توبہ
خود اپنے دل سے مجھے مدتوں حجاب رہا

جو اٹھ گئیں وہ نگاہیں تو کیا کرو گے حفیظ
پناہِ زہد میں اتنک تو یہ شباب رہا

کب آپ کے ایسے عدوں سے تسکینِ دلِ ناکام ہوئی
اک صبح قیامت یاد آئی جب کوئی پکارا شام ہوئی

کیا جانئے دل کو توبہ کی یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی
اسکے بھی کرم پر حرف آیا اپنی بھی خطا بدنام ہوئی

الفت کے تجلی پانے تک بے نور تھے حکمت کے جلوے
جب دشتِ جنوں میں صبح ہوئی زندانِ خرد میں شام ہوئی

بھڑکی ہوئی آگ دبائی بھی تو اٹھتا دھواں کب رکتا ہے
ہم ضبطِ فغاں کرتے ہی رہے اور دل کی حکایت عام ہوئی

اس غم میں حفیظؔ آخر کب تک چپ چپ سے کھوئے کھوئے سے
سودائے محبت چھوڑ بھی اب اٹھو دیکھو شام ہوئی

کتنے اہل ہوش کس کس طرح بہکانے اٹھے
آپ کے کوچے سے اٹھنے تھے نہ دیوانے اٹھے

رنج و راحت کا وہ یوں مفہوم سمجھانے اٹھے
راہ میں کانٹے بچھا کر پھول برسانے اٹھے

وہ جو خالی کر کے میخانے کے میخانے اٹھے
آخرش ان مست نظروں کی قسم کھانے اٹھے

آج کی بدحال دنیا کے بھی دن پھر جائینگے
اے مؤرخ ہم اگر تاریخ دہرانے اٹھے

ظرف ساقی ہی نہ جب دیکھا تو پھر کیا بیٹھتے
آنسوؤں سے بھر کے ہم آنکھوں کے پیمانے اٹھے

غمگسار آئیں نہ آئیں بزم برپا ہو نہ ہو
دل جلوں سے دل جلے کہہ سن کے افسانے اٹھے

اب خدا حافظ متاعِ دین و دانش کا حفیظ
واعظ کج فہم بھی تقریر فرمانے اٹھے

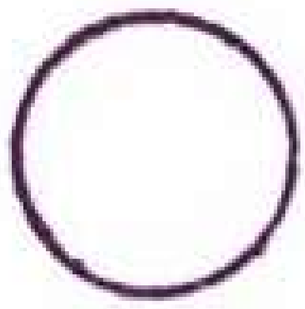

گاہ مٹتی ہے گہہ ابھرتی ہے
آرزو دل سے چھیڑ کرتی ہے

ان کی رنگینیاں سنبھل جائیں
اب مری سادگی سنورتی ہے

کہتی ہی رہتی ہے خودی جس کو
بیخودی وہ بھی کر گزرتی ہے

گڑ کے رہ بھی گئی حیا سے تو کیا
وہ نظریں بھی کام کرتی ہے

ہجر میں ہم تڑپ تو لیتے ہیں
کیا خبر ان پہ کیا گزرتی ہے

○

بے تابیاں ہیں اور نہ غمِ انتظار ہے
یہ اعتبار ہے کہ عدم اعتبار ہے

کیا عہد تھا کہ آپ کی نفرت بھی تھی عزیز
کیا وقت ہے کہ آپ کی الفت بھی بار ہے

سچ جان میں نے تیری تمنا کبھی نہ کی
اور یوں ترے کرم کا تجھے اختیار ہے

آپ اور دعائے مرگِ جوانی بہ چشمِ تر
کیا تلخیِ حیات بہت ناگوار ہے

کافر سرورِ عشق تو تھا ہی مگر حفیظؔ
اس سے بھی کچھ لذیذ یہ ظالم خمار ہے

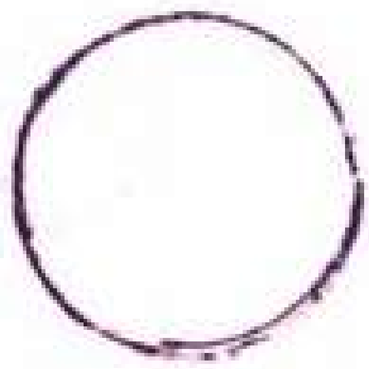

اف رے شکایتِ جفا، واہ رے شکوۂ ستم
ہنستے رہے حضور میں، رو دیئے دور جا کے ہم

دستِ ہوس میں سیف ہے، جہل کے ہاتھ میں قلم
معرکۂ حیات میں رہ گئے خالی ہاتھ ہم

ہائے یہ کیا مقام ہے، ہائے یہ کیا نظام ہے
عشق کی آستیں بھی نم، حسن کی آستیں بھی نم

ایسا بھی انقلاب کیا، شیخ تمہیں یہ کیا ہوا
رخ تو ہے سوئے تبکدہ، پشت ہے جانبِ حرم

لاکھ ہم اہلِ درد سے دوست الگ تھلگ رہے
ہائے وہ زہرِ خند جو ہو کے رہا شریکِ غم

شاید اسی طرف سے کچھ لطف میں ہو گئی کمی
جانبِ کوئے دوست جو آج نہ اٹھ سکے قدم

اف تری بے نیازیاں توبہ
اٹھ گیا اعتبارِ دیر و حرم

ہائے وہ سادگی رنگا رنگ
ایک عالم میں سیکڑوں عالم

ان کی دزدیں پڑ رہی ہے نظر
اپنے لغزیں اٹھ رہے ہیں قدم

دیکھنا رنگِ روئے حسن حفیظؔ
عشق کی نبض ہو چلی مدّھم

زہے طلب جستجو کی راہیں قدم قدم پر بدل رہے ہیں
سنبھل رہے ہیں بہک رہے ہیں، بہک رہے ہیں سنبھل رہے ہیں

کہاں وہ بزمِ ازل کے جلوے کہاں یہ بیت و حرم کے پردے
جمالِ رخ پر مچلنے والے نقابِ رخ سے مچل رہے ہیں

نہ ہے گدازِ غمِ محبت، خوشا یہ آدابِ سوزِ الفت
نہ کچھ دھواں ہے نہ کوئی شعلہ بڑے سلیقے سے جل رہے ہیں

اس سے مجروح مرا ذوقِ الم ہوتا ہے
ظلم کرتا ہے جو اُس پہ کرم ہوتا ہے

اب قدم اہلِ جنوں ہی کو اٹھانا ہوگا
ہوش والوں میں تو یہ حوصلہ کم ہوتا ہے

ہائے اس انجمنِ ناز کے آداب جہاں
زور سے دل کا دھڑکنا بھی ستم ہوتا ہے

شکریہ آپ کے اس گوشۂ دامن کا مگر!

اشک شوئی سے کہیں درد بھی کم ہوتا ہے

بیٹھنے بھی دے اب تو اے جنوں ٹھکانے سے
باز آئے ہم تجھ کو راہبر بنانے سے

اب بھی یاد آتے ہیں ان کے یاد آنے سے
خواب کچھ سنہرے سے وقت کچھ سہانے سے

راہ طنز کرتی ہے روٹھ جاتی ہے منزل
کارواں جھجکتا ہے جب قدم بڑھانے سے

احباب سے کہدو ذرا دامن کو بچائیں
میں ڈوب رہا ہوں مرے نزدیک نہ آئیں

اس دور کے عیسیٰ تو یہی سوچ رہے ہیں
ہر زخم کو کس طرح سے ناسور بنائیں

کیا اب بھی مرے درد کا درماں نہیں ہوگا
اللہ مرے حال پہ روتی ہیں دعائیں

ہٹا ہٹا کے مقاماتِ ایں و آں سے مجھے
قریب کر دیا دل نے اس آستاں سے مجھے

حیات و موت کرشمے ہیں ان کی شوخی کے
کبھی یہاں سے پکارا کبھی وہاں سے مجھے

جو ان کے منہ سے جھڑے تھے وہ پھول رشک لئے
گلہ رہے گا یہ دامانِ کہکشاں سے مجھے

کہیں نہ موجبِ الزامِ ناسپاسی ہوں
یہ خوف ہے ترے الطاف بیکراں سے مجھے

بتوں کے بخل کی حد ہو گئی خدا کی قسم
جواب تک نہ ملا ان کے آستاں سے مجھے

فرازِ ناز، نشیبِ نیاز، سطحِ گداز
تباہیوں نے پکارا کہاں کہاں سے مجھے

یہ پرخلوص فضائیں کہاں ملیں گی حفیظؔ
اٹھا نہ اہلِ محبت کے درمیاں سے مجھے

بشر سے ہو نہ سکا دردِ زیست کا درماں
بہت وسیع ہے کہنے کو عالمِ امکاں

میں سن رہا ہوں تری دھڑکنیں مگر اے دل
غمِ جہاں سے الگ تو نہیں غمِ جاناں

ربابِ عیش و طرب پر غزل سرا شاعر
تلاشِ امن و سکوں میں حیات سرگرداں

کچھ اور ڈھونڈھ رہی ہے نگاہِ اہلِ نظر
نہ گیسوؤں کی گھٹائیں نہ عارضِ تاباں

یہ ہانپتے، کانپتے، سطحی سے، ناتواں تنکے
ڈبو دیے انہیں تنکوں نے سینکڑوں طوفاں

دریدہ پیرہنی پر بھی فقرِ جامہ زیب
ہوس ہزار طرح کے لباس میں، عریاں

شگفتگی بھی ہے تاثیر بھی، بصیرت بھی
پسند آئی تمہاری غزل حفیظ میاں

سوز نہ ہو تو ساز حیات
صرف اک روکھی پھیکی بات

جل اٹھ جل اٹھ شمع یقیں۔
رات ہے اور اندھیری رات

آہ! یہ حسن کی نا یابی
اف یہ جلوؤں کی بہتات

ان کا کھیل دل آزاری
اور مرے نازک جذبات

جان ہتھیلی پر رکھ لے
کہنی ہے گر سچی بات

معصوموں پر آئے ہیں
کیسے کیسے الزامات

کوئی ہنسے کوئی روئے
یہ اپنے اپنے حالات

نامحکم بنیاد ہوس
عشق سراپا صبر ثبات

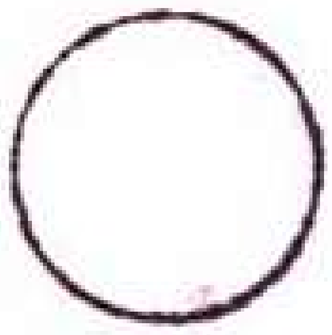

کس جگہ بیٹھیں بھلا ہم چین سے آرام سے
کوئی گوشہ بھی نہیں خالی تمہارے دام سے

سہمی سہمی دھوپ سائے لرزہ براندام سے
کون ٹکرانے اٹھا یہ گردشِ ایام سے

اے گھٹا کہیو سلامِ شوق خاص و عام سے
میکشوں سے، ذرے، ساقی سے، سبو سے، جام سے

جاں نثاروں کی وفا کا امتحاں لیتے ہیں آج
وہ جو واقف بھی نہ تھے کل تک وفا کے نام سے

ہل گیا مستوں کی ہاؤ ہو سے میخانہ مگر
ایک قطرہ بھی نہیں چھلکا کسی کے جام سے

کون کہتا ہے ہمارے دوستوں میں تھا حفیظ
کیا تعلق ہمکو اس برباد سے بدنام سے

بے قرینہ ہو کے پھیکا پڑ گیا پھولوں کا رنگ
خار و خس ترتیب پا کر خوشنما سے ہو گئے

جانے کیا آیا حریم ناز و نعمت سے جواب
جو سراپا شوق تھے بے مدعا سے ہو گئے

اٹھ گیا بالکل ہی جب عشق و ہوس کا امتیاز
ہم تری محفل سے دل برداشتہ سے ہو گئے

دورِ غم میں کون انجامِ تعلق دیکھتا
آپ ہی اپنوں سے ہم نا آشنا سے ہو گئے

خدمتِ شعر و سخن بھی کیجیے کچھ تو حفیظ
آپ تو رنج و محن میں مبتلا سے ہو گئے

تواضع کر رہا تھا جب چمن خارِ مغیلاں سے
جنوں کا دستِ شفقت دور کیوں ہتا گریباں سے

گئے وہ دن رہا کرتے تھے ساحل پر بھی لرزاں سے
سفینے خود الجھنا چاہتے ہیں آج طوفاں سے

مری غمخوار دنیا کو بہت تکلیف ہوتی ہے
مرے غمگین چہرے سے مرے حالِ پریشاں سے

مری راہوں میں کانٹے ہیں مری منزل ہے شعلوں میں
کوئی کیوں باندھتا ہے اپنا دامن میرے دامن سے

جائیے ہو کے بے قرار کہاں
سب ہیں غمگین، غمگسار کہاں

اب کے پھولوں میں وہ مہک ہی نہیں
لٹ گئی عصمتِ بہار کہاں

دیر کے پاس یا حرم کے قریب
ہم کریں تیرا انتظار کہاں

ہر گھڑی لب پہ ذکرِ یار تو ہے
دل میں ہر دم خیالِ یار کہاں

اوپری مسکراہٹوں کی قسم
اٹھ سکا تیرے غم کا بار کہاں

ایک انداز پر رہے نہ قائم
زندگی اتنی وضعدار کہاں

ہائے اس دورِ جو و نمائی میں
پردہ داری بھی پردہ دار کہاں

درد ہی چین سے نہیں رہتا
دل میں گنجائش قرار کہاں

سہ سکے بار آشیانے کا
شاخِ گل اتنی پائیدار کہاں

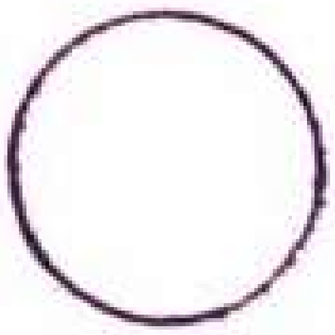

کہاں یہ سطح پسندی ادب کو لے آئی
جہاں نظر کی بلندی نہ دل کی گہرائی

اب آدمی کا ٹھکانہ، نہ کائنات کی خیر
سنا ہے اہلِ خرد ہو گئے ہیں سودائی

ہزار حیف کہ ہم تیرے بے وفا ٹھہرے
ہزار شکر کہ ہم کو ہوس نہ راس آئی

اب اپنے جیبِ گریباں کا کیا سوال رہا
جنوں کا ہاتھ بٹانے کو خود بہار آئی

حیات پوچھ رہی تھی سکون کا مفہوم
تڑپ کے دل نے ترے درد کی قسم کھائی

اسی کی راہ میں آنکھیں بچھائیگی منزل
وہ عزم جو نہیں محتاجِ ہمت افزائی

مشاعروں میں حفیظؔ آج کل وہی جائے
کہ جس کو خدے زیادہ ہو ذوقِ رسوائی

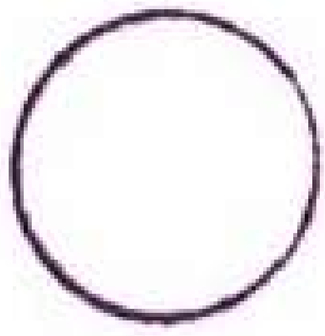

چھا جائے گی ماحول پہ کچھ اور اداسی
بجھتی ہوئی شمعوں سے چراغاں تو نہ ہوگا

انسان کو انسان کا غمخوار بنا دے
اس دور سے یہ کار نمایاں تو نہ ہوگا

خود اس نے کہا ہے تو اسے کیوں نہ بھلا دوں
جاناں سے زیادہ غم جاناں تو نہ ہوگا

توجہ ہی انھیں جب دل یہ فرمانی نہیں ہوتی
کوئی شے بھی دوائے دردِ پنہانی نہیں ہوتی

نہ جانے اس زمین و آسماں کا حشر کیا ہوگا
جہانگیروں سے بھی یارب جہاں بانی نہیں ہوتی

زباں بندی سے کب جذبات کا سیلاب رکتا ہے
حدودِ بحر کی پابند طغیانی نہیں ہوتی

ادائے فرض پر اہلِ وفا کا شکریہ کیا
محبت میں تو قربانی بھی قربانی نہیں ہوتی

نہیں ہٹتا دھندلکا بدگمانی کا نہیں ہٹتا
نہیں ہوتی فضائے بزم نورانی نہیں ہوتی

کھلی آنکھوں سے میں نے معجزاتِ عشق دیکھے ہیں
خرد کے شعبدوں پر مجھکو حیرانی نہیں ہوتی

ترے ماتھے کی شکنیں سرکشی کی داستانیں ہیں
دلیلِ عجز سجدوں کی فراوانی نہیں ہوتی

حفیظ اپنی زباں تو وقفِ اظہارِ حقیقت ہے
برائے غیرِ حق مجھ سے غزل خوانی نہیں ہوتی

عقلِ آوارہ کہیں جہلِ بداماں تو نہیں
ہر نئے نظم سے بزم اور پریشاں تو نہیں

موجیں سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی سطحِ دریا
آج کشتی کوئی آمادۂ طوفاں تو نہیں

ابھی دیوانہ بنوں گا ابھی آئے گی بہار
ان کے دامن سے عزیز اپنا گریباں تو نہیں

دہر میں اور بھی سامانِ سکوں ہیں لیکن
ہر گھنی چھاؤں ترا سایۂ مژگاں تو نہیں

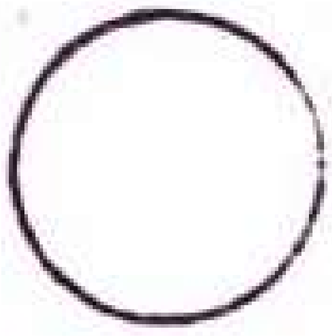

خرد کرتی حقیقت آشنا کیا
سوائے وہم اسکے پاس تھا کیا

محبت کچھ تجارت تو نہیں ہے
دلِ ناداں وفاؤں کا صلہ کیا

کبھی تنہائی میں سن دل کی آواز
رباب و چنگ و بربط کی صدا کیا

مجھے خود سے بھی دلچسپی نہیں اب
کسی کی بے نیازی کا گلہ کیا

حسیں خوابوں کی تعبیریں کہاں ہیں
محبّت نے مجھے دھوکا دیا کیا ؟!

قدم جب رکھ دیا راہِ طلب میں
تو پھر کیفیتِ بیم و رجا کیا!

چھپا جاتا ہے منھ ہاتھوں کے پیچھے
پشیمانی بھی ہے شرطِ دعا کیا

حسنِ جنوں نواز کا دیکھا جو التفات
مستی میں آ کے موت سے ٹکرا گئی حیات

اب وہ ترا خیال نہ بیزاریٔ حیات
نفرت بھی بے ثبات محبت بھی بے ثبات

اے محوِ انتظار ستارے نہیں ہیں یہ
ہنستی ہے تیری سادہ دلی پہ اندھیری رات

بے مہریاں بڑھی ہیں زمانہ کی جس قدر
اتنی ہی یاد آئی ہیں ان کی نوازشات

جس سمت دیکھئے وہیں رستے ہوئے زخم
ویسے بڑا حسین ہے دورِ ترقیات

طے کیجئے گا دار پہ کہنا ہے کیا حفیظ
اک بزدلی کی بات ہے اک مردمی کی بات

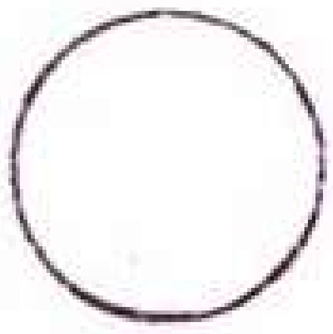

اپنی آنکھوں سے لہو اپنا جگر دیکھ لیا
جو کچھ آیا تری محفل میں نظر دیکھ لیا

ایک بار آیا تھا تعمیر نشیمن کا خیال
ہر طرف سلسلۂ برق و شرر دیکھ لیا

اتنا ہی جانئے اس دور میں مفہوم سکوں
جان سی آگئی جب دوش پہ سر دیکھ لیا

جگمگانے لگے ذرے تو ستارے نہ رہے
تیرا اندھیر بھی اے نورِ سحر دیکھ لیا

یہ دل و جان تو اک جام کی قیمت بھی نہیں
ہائے کیا ہو گا جو ساقی نے ادھر دیکھ لیا

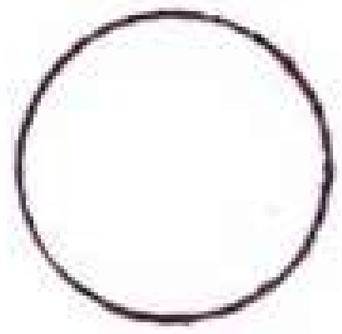

اک اشک مظہر صد اضطراب ہو بھی چکا
ستارہ رشک مہ و آفتاب ہو بھی چکا

دماغ اہل سیاست پہ اعتبار نہ کر
دماغ اہل سیاست خراب ہو بھی چکا

کھلیں کہ بند رہیں راحتوں کے دروازے
حریم صبر میں دل باریاب ہو بھی چکا

قصورِ دار منزلوں سے جب رہے محروم
شکستِ دل نے خبر دی عتاب ہو بھی چکا

اسی لئے تو یہ مضراب و تار روتے ہیں
حفیظؔ تارکِ چنگ و رباب ہو بھی چکا

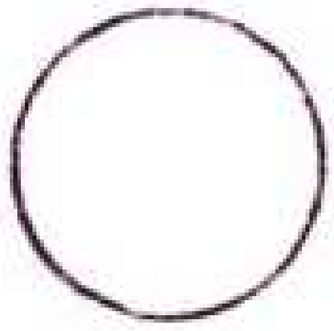

اس خلش کا کم سے کم اتنا تو درماں چاہیئے
ایک نشتر ہر نفس جزوِ رگِ جاں چاہیئے

ڈوب جائے گی یہ کشتی گر اسے ساحل ملا
زندگی کو ہر قدم پر ایک طوفاں چاہیئے

یہ فریبِ آب و گل ہے اس پہ کیا اٹھے گی آنکھ
روحِ گلشن چاہیئے، جانِ گلستاں چاہیئے

اور ہمت ہو تو یہ پردہ بھی کر دے چاک چاک
سانس بھی کیوں درمیانِ جان و جاناں چاہیئے

وجد سا آنے لگا ہے اہلِ محفل کو حفیظ
تیرے بعد ایک اور تجھ سا ہی غزلخواں چاہیئے

نظر یہ کیوں ہیں مناظر گراں نہیں معلوم
یہ رونقیں ہیں کہ ویرانیاں نہیں معلوم!

خرد کی بات پہ ہنس کر گذر بھی جائے دل
خرد کو فرقِ یقین و گماں نہیں معلوم

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اٹھے گا دھواں نہیں معلوم

تمام راہ لہو میں ہے غرق اے منزل
کہاں تک آئے تھے سود و زیاں نہیں معلوم

خلوصِ عشق ذرا تو ہی دیکھنا بڑھ کر
حجاب ہے کہ نظر درمیاں نہیں معلوم

حفیظ ہم تو روانہ ہوئے، خدا حافظ!
قدم اٹھائے گا کب کارواں نہیں معلوم

تیری مقدس یاد بخیر، لاکھ ہو دورِ حرص و آز
عہدِ وفا نے روک لیا جب بھی ہوس نے دی آواز

کوئی کہاں تک جانے گا، کوئی کہاں تک سمجھے گا!
دنیا کی محفل کا ہے ہر ذرہ دنیائے راز!

لال نہیں ہے کس کا منہ اس دورِ خونخواری میں
جیسے جس کے بازو ہیں ویسی ہی اس کی پرواز

بلبل کے نغموں پہ نہ جا، گل کی رنگینی مت دیکھ
میرا فسانہ مجھ سے سن میں خود ہوں اپنی آواز

بزمِ طرب میں آج ذرا ہم بھی موئے تھے نغمہ سرا
لیکن اپنی چیخوں کی سازسے کیا ملتی آواز!

بربادیاں بھی عشق میں بے فائدہ نہیں
اب آس پاس اہلِ ہوس کا پتا نہیں

مقدور اگر دوا کا نہیں ہے دعا ہی کر
قسمت کا آسرا تو کوئی آسرا نہیں!

کافی ہے صرف اپنے پرائے کا امتیاز
اس دورِ بے بصر میں کچھ اچھا برا نہیں

اللہ رے اس غریب تمنا کی بیکسی
دل بھی کبھی کبھی جسے پہچانتا نہیں

بانگِ جرس ہے قافلہ والوں کی ہر صدا
اور دور دور ذوقِ سفر کا پتا نہیں

تو اس سے بدگمان نہ ہو یہ ترا حفیظؔ
کتنا ہی بے نیاز سہی بے وفا نہیں

اگر دل سوزِ الفت کا امانت دار ہو جائے
تو ہر آتش کدہ گلزار ہی گلزار ہو جائے

عجب کیا ہے اسی ہمت شکن طوفاں کے پہلو سے
کوئی ایسی بھی موج اٹھے کہ بیڑا پار ہو جائے

جفا کاروں کے اس طرزِ جفا کی داد دیتا ہوں
ستم ڈھانے لگے کوئی، کوئی غمخوار ہو جائے

مغنّی تیرے نغموں نے تو انسان کو سلایا ہے
مری چیخوں سے شاید آدمی بیدار ہو جائے

نہ ہو جو معترض باطل خداؤں کی خدائی پر
یہ مشکل ہے حفیظؔ اس قسم کا دیندار ہو جائے

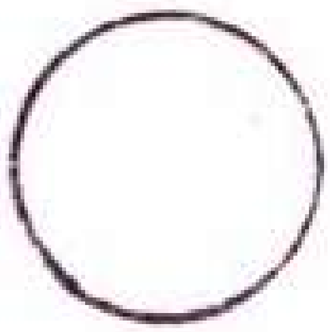

رشکِ فردوس! ہم اس سیر و سفر سے گذرے
دل لرزا ٹھا وہ نظارے نظر سے گذرے

راہ روکے ہوئے خود راہنما بیٹھے ہیں
اب کوئی قافلہ گذرے تو کدھر سے گذرے

اف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گذر سے گذرے

حسنِ منزل کی قسم، زندگیِ دل کی قسم
رقص کرتے ہوئے ہم برق و شرر سے گذرے

جانے کیا کہہ گئے ماحول سے جاتے جاتے
وہ اندھیرے جو ابھی چاکِ سحر سے گذرے

کوئی چپکے سے دیا دل کا جلا کر سو جائے
کاروانِ مہ و انجم جب ادھر سے گذرے

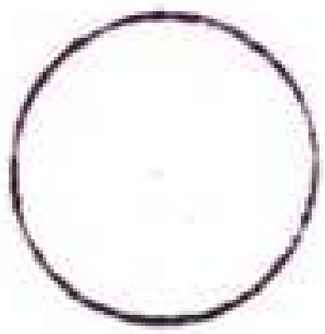

جب دیکھنے کی طرح سے دیکھا تری جانب
پردے بھی نمایاں ہوئے جلوے بھی نظر آئے

خاکے بھی نہ بن پائے ابھی اہل گماں سے
کچھ اہل یقیں خوں سے ادھر رنگ بھی بھر آئے

اک عشق سبک سر ہی سردار ہے تنہا
ارباب خرد آئے نہ اصحاب نظر آئے

جب بھی کسی جانب سے ہوا ان پہ کوئی وار
ہو ہو کے شہیدانِ وفا سینہ سپر آئے

مٹتی ہی نہیں اب ترے جلووں سے نگاہیں
آنکھوں کو بڑی دیر میں آداب نظر آئے

یہ وقت عمل اور یہ حفیظ آپ کی مستی
اچھی نہیں وہ نیند جو ہنگامِ سحر آئے

ہوا قدر داں! اس قدر تو زمانہ
کہ جس کی سپر ہوں اسی کا نشانہ

بہت اس سے اونچی ہے پرواز میری
میں ہرگز نہیں بندۂ آب و دانہ

اس اک مرکزِ دین و دنیا سے ہٹ کر
نہ تیرا ٹھکانہ، نہ میرا ٹھکانہ

نہ پڑ ماضی و حال کی اُلجھنوں میں
صداقت نہیں ہے اسیرِ زمانہ

مجھے دوستی کی قسم دینے والے
مری دشمنی بھی نہیں دشمنانہ

کوئی مرحلہ ہو، کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ، قدم عاشقانہ

حفیظؔ اس میں شاملِ خلوصِ عمل ہے
نہیں شاعری یہ فقط شاعرانہ

---

۳ ہائے اس دوریٔ منزل پہ یہ اندازِ خرام!
کارواں موجِ رواں سیلِ رواں ہو جاتا

یہ بھی اچھا ہوا تجھ پر نہ کھلا رازِ حیات
سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہو جاتا!

پھر کوئی چیز نہ دنیا میں حقیقت رہتی
عشق سا واقعہ گر وہم و گماں ہو جاتا

مٹ گیا باغ سے ناموسِ خودی کی خاطر
گل کہاں رہتا جو ہمرنگِ خزاں ہو جاتا

جوہرِ فن بھی کوئی شے تھی نمائش کی حفیظؔ
تم عیاں کرتے نہ کرتے یہ عیاں ہو جاتا

کہاں کے مالک و مختار ہم تو کچھ بھی نہیں
فریب دے نہ دریار ہم تو کچھ بھی نہیں

مری جھجک پہ وہ ساقی سے شیخ کا ارشاد
بس اک یہی تو ہیں ہشیار ہم تو کچھ بھی نہیں

جب ان کے پاس گئے لیکے دردِ دل تو کہا
ہمیں نہ چھیڑیئے بیکار ہم تو کچھ بھی نہیں

ہر انقلاب تماشہ ہے بے دلوں کے لئے
نہ بے وفا نہ وفادار ہم تو کچھ بھی نہیں

کہاں وہ گرمیٔ گفتار ہم ہی سب کچھ ہیں
کہاں یہ سردیٔ کردار ہم تو کچھ بھی نہیں

سا ادھر جو چھاؤں سی دیکھی تو آ کے بیٹھ گئے
لرزہ سایۂ دیوار ہم تو کچھ بھی نہیں

نکالتا تھا چمن سے حفیظ کو پہلے
یہی ہے واقعی اک خار ہم تو کچھ بھی نہیں

آخرش چوٹ کھا گئی دنیا
اپنی ہی زد میں آ گئی دنیا

آدمی نے کب آنکھ کھولی ہے
آہ جب مٹ مٹا گئی دنیا

رات کو رات کہہ دیا میں نے
سنتے ہی بوکھلا گئی دنیا

ساتھ چلنا تو خیر مشکل تھا
روکنے سے بھی کیا گئی دنیا

ٹھوکریں در بدر کی کھا کھا کر
ان کے قدموں میں آ گئی دنیا

تجھ سے بھیرا تری قسم دے کر
کیا کروں بھید پا گئی دنیا

کس نے سمجھا ہے میرے غم کو حفیظ
گدگدا کر رلا گئی دنیا

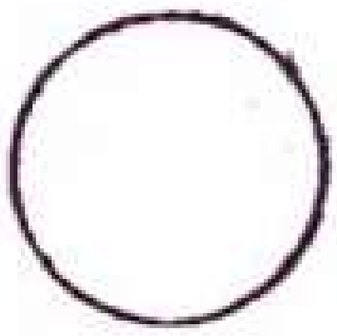

کیسی ہی مصیبت ہو بڑے شوق سے آئے
کم ظرف کے احسان سے اللہ بچائے

اب تک دیئے جاتے ہیں دلاسوں پہ دلاسے
وہ جھوٹے سہارے جو کبھی کام نہ آئے

میں آج نئے عزم سے پر تول رہا ہوں
کوئی مری پرواز کی راہوں میں نہ آئے

پھولوں کو تو سرخوب چڑھاتا ہے زمانہ
ہے کوئی جو کانٹوں کو بھی سینہ سے لگائے

دامن کا کبھی غم ہے، کبھی فکرِ گریباں
ہم ہوش میں آئے بھی تو کیا ہوش میں آئے

جس شاخ نے آغوش میں کلیوں کو کھلایا
اس شاخ نے پھولوں کے جنازے بھی اٹھائے

رہتا ہے حفیظ اہلِ تکبر سے گریزاں
اس شاعرِ مغرور کو منہ کون لگائے

بلبل ہی کوئی مائلِ آہ و فغاں ملے
گلشن میں زندگی کا کہیں تو نشاں ملے

ہاتھ آگئے جو چاند ستارے تو کیا ہوا
اس آستاں کی خاک کے ذرّے کہاں ملے

اے کاش میرے اجڑے نشیمن کے سامنے
خاموش سر جھکائے ہوئے باغباں ملے

اللہ رے بہار کی یہ چیرہ دستیاں
دامن یہاں ملے تو گریباں وہاں ملے

چھوٹوں سے یوں بڑوں کو تکبر نہ چاہیئے
جھک کر ملے زمیں سے اگر آسماں ملے

اے دل ہجومِ غم میں غنیمت ہے بے کسی
چیخیں نکل پڑیں جو کوئی مہرباں ملے

آتی تھی قہقہوں کی صدا دور سے حفیظ
دیکھا قریب جا کے تو آنسو رواں ملے

جنونِ شوق سے جب کام جھنجھلا کر لیا میں نے
حوادث کو ہم آہنگِ تمنّا کر لیا میں نے

الٰہی کون سی منزل ہے یہ دنیا پرستی کی!
کسی نے نام پوچھا اور سجدہ کر لیا میں نے

نہ ہوں حیران میرے قہقہوں پر مہرباں میرے
فقط فریاد کا معیار اونچا کر لیا میں نے

خزاں کے خوف سے پھولوں نے شکلیں تک بدل ڈالیں
ادھر رنگ قبا کچھ اور گہرا کر لیا میں نے

کبھی ایسی بھی رت لائے گی فطرت بلغِ عالم میں
کہ جب جس شاخ پر چاہا بسیرا کر لیا میں نے

ادھر آ تجھ سے رازِ سوز و سازِ زندگی کہہ دوں
رگوں میں خون، دل میں درد پیدا کر لیا میں نے

رسا ہوں یا نہ ہوں نالے یہ نالوں کا مقدر ہے
حفیظ آنسو بہا کر جی تو ہلکا کر لیا میں نے

یہ کمال سادگی ہے کہ مقام بے نیازی
مرا کھیل سنگ باری، میرا کام شیشہ سازی

کوئی ہوش سے گریزاں، کوئی جوش سے گریزاں
وہ جنوں کی حیلہ سازی، یہ خرد کی حیلہ سازی

تری تیغ خوں سے رنگیں، تری لاش خوں سے رنگیں
بایں واقعات خونیں نہ شہید تو نہ غازی

وہ تباہِ زورِ بازو، یہ خراب رسمِ تقویٰ
کہ عجم نرا سیاہی، تو عرب نرا نمازی

یہ خلوص ہی کی نعمت ہے شریعتوں کی عصمت
جو یہ ہو تو دین داری، یہ نہ ہو تو دین بازی

میں قدامتوں سے توبہ تو ہزار بار کرلوں
مگر اس جدیدیت کا کوئی وصف امتیازی

کبھی فخرِ میکدہ تھے جو وہی حفیظ صاحب
سرِ بزم دینے آئے ہمیں درسِ پاکبازی

دور ہوتی جا رہی ہے منزلِ انسانیت
جانے یہ دنیا ہے کس کافر کی بھٹکائی ہوئی

ہر گھڑی عہدِ محبت، ہر نفس پاسِ وفا
بیڑیاں یہ بھی ہیں لیکن انکی پہنائی ہوئی

ہو گئی شاید مسرت کی حقیقت بے نقاب
ہر مغنّی کی صدا ہے آج بھرائی ہوئی

کتنا اونچا ہے زمانہ کا یہ معیارِ خلوص
قعرِ گمنامی سے ہم نکلے تو رسوائی ہوئی

میری جانب سوچ کر بڑھنا ذرا اہلِ کرم
ہاں یہ دنیا ہے اسی سائل کی ٹھکرائی ہوئی

کسی جبیں پر شکن نہیں ہے کوئی بھی مجھ سے خفا نہیں ہے
بہ غور میرا پیام شاید ابھی جہاں نے سنا نہیں ہے

سلام کی جرأتیں نہیں ہیں نگاہ کا حوصلہ نہیں ہے
اگر وہ قسمت سے مل گئے ہیں تو اب ہمارا پتا نہیں ہے

غلط ہے تیرا خیال اے دل، سمجھ نہ اتنا بھی اسکو غافل
یہ درد میں دلکشی سی کیوں ہے اگر وہ درد آشنا نہیں ہے

سفینۂ عہد نو پہ چھایا ہوا ہے بہروپیوں کا لشکر
یہاں ہر اک ناخدا نما ہے مگر کوئی ناخدا نہیں ہے

خیال کے دیوتا بھی جھوٹے، عمل کے اندھے خدا بھی جھوٹے
خرد بھی فریاد رس نہیں ہے، جنوں بھی مشکلکشا نہیں ہے

ہر ایک مسکیں کے ظرف سے باخبر ہے کتنی نگاہ ساقی
کس کو ہے حکم جاں نثاری، کسی کو اذن وفا نہیں ہے

کہاں کا شاعر خدائے شعر و سخن کبھی ہم اسکو مان لیتے
حفیظ میں یہ بڑی کمی ہے کہ بندۂ خود نما نہیں ہے

کارواں چاہے مختصر ہو جائے

کوئی رہزن نہ ہم سفر ہو جائے

خام اب بھی نہیں ہے عشق مگر
چوٹ کھائے تو پختہ تر ہو جائے

بارِ مرہم بھی زخم پر منظور
تاکہ تسکین چارہ گر ہو جائے

اس فریبِ سکون و راحت پر
اتنا ہنسئے کہ آنکھ تر ہو جائے

ہو نہ تقدیر کا اگر قائل
آدمی آدمی کے سر ہو جائے

دھڑکنیں ہیں اب اہلِ دل کا پیام
سننے والا قریب تر ہو جائے

سچ ہے اچھا نہیں کلام حفیظؔ
کاش تو صاحبِ نظر ہو جائے

بالآخر جان دے کر جستجو کا حق ادا کرتے

بہت نزدیک تھی منزل اگر کچھ حوصلہ کرتے

یہ اپنی تنگ ظرفی ہے کہ ہم خود بھی نہیں اپنے
زمانہ اپنا ہو جاتا اگر آغوش وا کرتے

سکوں اب خود فریبی میں نہ کچھ عالم فریبی میں
حقیقت آشنا ہوتے حقیقت آشنا کرتے

عجب کیا تھا اسی میں سے دوا بھی کوئی مل جاتی
ابھی کچھ اور دردِ زندگی کا تجزیہ کرتے

حفیظ اب مرحبا کے شور سے تسکیں نہیں ہوتی
کبھی نقد و نظر سے بھی غزل کو آشنا کرتے"

دلائل کی ترازو میں خدا کو تولنے والے
مجھے اتنا ہی سمجھا دے بشر کیوں ہے بشر کیا ہے

سفر ہی ابتدا میری، سفر ہی انتہا میری
مسافر ہوں مجھے اندیشۂ شام و سحر کیا ہے

دھندلکوں سے بھی گذرا ہوں اندھیروں سے بھی گذرا ہوں
مرے اللہ یہ تاریکیٔ قلب و نظر کیا ہے

یہ محفل ہے یہاں شمعیں تو گل ہوتی ہی رہتی ہیں
مگر اے ہم نفس یہ رخصت سوز جگر کیا ہے

کسی صورت نمودِ زندگی کی راہ تو نکلے ۔۔!
کوئی طوفاں ہی برپا کر اگر ساحل نہیں ملتا

تساہل باعثِ رسوائیٔ فکر و نظر بھی ہے
جہاں کل تھا وہاں اب جادۂ منزل نہیں ملتا

اگر توفیق ہو اک مرگِ بامقصد کی خواہش کر
دواؤں کے ذخیروں سے سکونِ دل نہیں ملتا

کہاں تک کام دیگا زیر و بم بے روح نغموں کا
حدی خواں سے مزاجِ ناقۂ محمل نہیں ملتا

ہمّت کو ہی جب سلسلہ جنباں نہیں دیکھا
پھیلا ہوا پھر عالمِ امکاں نہیں دیکھا

کیا پردہ دری اس سے ہو اسرارِ جنوں کی
چھو کر بھی کبھی جس نے گریباں نہیں دیکھا

مانگے گئے دنیا کے اندھیروں سے اجالا!
اور اپنا چراغِ تہ داماں نہیں دیکھا

اے عصرِ رواں تیرا جہاں روشن و تاباں
سب کچھ یہاں دیکھا مگر انساں نہیں دیکھا

گاتا ہے حفیظ آج بھی آزاد ترانے
گلشن نے شاید درِ زنداں نہیں دیکھا

سر پھرے باندھے ہوئے سر سے کفن پھرتے ہیں
کج کلاہی کی ہے کچھ فکر، نہ پگڑی کا خیال

جھڑکیوں پر بھی نہ مایوسِ کرم ہوتے ہم
بیچ میں آ گیا ناموسِ گدائی کا سوال

آج بھی پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ ماضی کے نقوش
ہم سے میخانے کا دیکھا نہیں جاتا یہ حال

آ نہ جائے کوئی دھبہ ترے دامن پہ کہیں
شیخ خوش پوش گنہگاروں پہ کیچڑ نہ اچھال

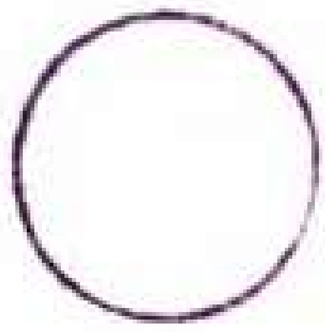

کئی منزلیں تراشیں کئی کارواں بنائے
جو سفر کا نام آیا مرے پاؤں ڈگمگائے

وہ طلب بھی کیا طلب تھی وہ کشش بھی کیا کشش تھی
تری سمت یوں بڑھے ہم نہ خود اپنے ہاتھ آئے

کہیں کلفتوں کا رونا کہیں غفلتوں کا رونا!
کسی راستے میں کانٹے کسی راستے میں سائے

نہ اطاعتیں گذاریں نہ محبتیں نباہیں
نہ خدا کے کام آئے نہ بتوں کے کام آئے

وہی میری بیکسی پر لگے ہنسنے دور بیٹھ کر
جو وفا کا عہد کرتے مرے ساتھ ساتھ آئے

لو وہ بزمِ دوست میں بھی نہ بجھے حفیظ صاحب
کوئی ایسے نکتہ چیں کو بھلا کیسے منہ لگائے

اثر کیا خاک ہوگا اسکی باتوں کا زمانے پر
جو خود اک مستقل تنقید ہو اپنے فسانے پر

کہاں کا ناخدا، کیسے سفینے، دست و بازو کیا
خدا ہی یاد آتا ہے سہارے ٹوٹ جانے پر

ہزاروں ٹھوکروں میں جستجوئے مرگ کرتے ہیں
وہ جن کو زندگی ملتی تھی تیرے آستانے پر

مسلسل نامرادی کا نتیجہ اور کیا ہوتا
محبت طنز بن کر رہ گئی آخر زمانے پر

معاف اے نوگرفتارو، مرے پر نوچنے والے
مجھے مجبور کرتے تھے قفس کا در سجانے پر

میں کیوں اہلِ جہاں کی ترش روئی کا برا مانوں
گراں خوابی میں جھنجلایا ہی کرتے ہیں جگانے پر

یہی اک سبق دیا ہے مجھے مسلکِ فنا نے
کہ میں جاں کو جاں نہ سمجھوں جو ترا کہا نہ مانے

ترے عشق کے تقاضے کسے جائے بتانے
کہیں مستیوں کے حیلے، کہیں ہوش کے بہانے

بھلی رہنمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں
وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

انھیں زینتِ چمن میں کوئی کیوں شمار کر لے
ابھی برق کے بھی قابل نہ ہوئے جو آشیانے

بایں انقلابِ ہر دم، بایں ارتقائے پیہم
ترے نقشِ پا سے آگے نہ پہنچ سکے زمانے

انہیں غم کے موڑ پر بھی نہ ٹھہرنے دے مغنّی
حذرِ نشّۂ طرب سے تو گذر گئے ترانے

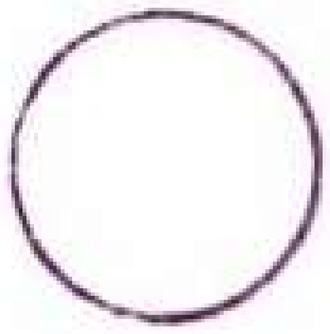

اس عزم میں عظمت کی کوئی بات نہیں ہے
جو عزم کہ پروردۂ آفات نہیں ہے

کچھ اوک سے پیتے ہیں تو کچھ جام بکف ہیں
ساقی تری محفل میں مساوات نہیں ہے

اب کھل کے کہو بات تو کچھ بات بنے گی
یہ دورِ اشارات و کنایات نہیں ہے

رعنائ افکار و خیالات کا مطلب
عریانی افکار و خیالات نہیں ہے

ہوتی ہے مقامِ رسن و دار سے حاصل
یہ زندہ دلی جنس خرابات نہیں ہے

ملتے ہی کچھ اس طرح امڈ آئے ہیں آنسو
جیسے کہ یہ رخصت ہی ملاقات نہیں ہے

جھک جھک کے سنبھل آپ نہ آداب بجا لائیں
یہ دادِ سخن ہے کوئی خیرات نہیں ہے

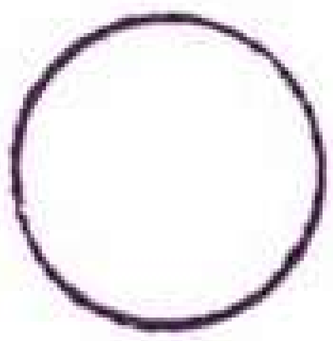

نہ جانے کتنے دل، کتنے جگر خوں ہو گئے ہوں گے
زبانوں پر یونہی الفت کے افسانے نہیں آئے

گلوں سے داغ، کانٹوں سے خلش لینے کو آئے ہیں
گلستاں میں ہم اپنے دل کو بہلانے نہیں آئے

کبھی جب امتیازِ حق و باطل کا سوال آیا!
ہمارے سامنے پھر اپنے بیگانے نہیں آئے

ابھی کیا ہے کل اک اک بوند کو ترسے گا میخانہ
جو اہلِ ظرف کے ہاتھوں میں پیمانے نہیں آئے

جمودِ زندگی میں بے پیئے ہلنا بھی مشکل تھا
جہادِ زندگی میں یادِ میخانے نہیں آئے

گلے مجھ کو لگا کر وہ کسی کا ناز سے کہنا
حفیظِ بے وفا ہم تجھ اپنانے نہیں آئے

دار و رسن نے کس کو چنا دیکھتے چلیں!
یہ کون سربلند ہوا دیکھتے چلیں

آئے گا پھر چمن پہ تصرف کا وقت بھی
پہلے قفس کی آب و ہوا دیکھتے چلیں

اوروں کی لغزشوں ہی پہ رکھیں نہ بس نگاہ
اپنی طرف بھی راہ نما دیکھتے چلیں

پروانوں کا تو حشر جو ہونا تھا ہو چکا
گذری ہے رات شمع پہ کیا دیکھتے چلیں

جاتے تھے ہم تو پھیر کے منہ جلوہ گاہ سے
لیکن دل و نظر نے کہا دیکھتے چلیں

تہذیب نو کے عہد میں انسانیت کے ساتھ
انساں نے کیا سلوک کیا دیکھتے چلیں

اس انجمن میں عشق کہاں ہے ہوس کہاں
کس کس کو کیا مقام ملا دیکھتے چلیں

ہاں اک نظر حفیظ یہ عبرت کے واسطے
کیا رہ گئی ہے قدر وفا دیکھتے چلیں

نہیں ہوتیں کبھی ساحل کے ارمانوں سے وابستہ
ہماری کشتیاں رہتی ہیں طوفانوں سے وابستہ

کہیں مسلی ہوئی کلیاں کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ

ہمارا ہی جگر ہے یہ، ہمارا ہی کلیجہ ہے
ہم اپنے زخم رکھتے ہیں نمکدانوں سے وابستہ

نہ لے چل خانقاہوں کی طرف شیخِ حرم مجھ کو
مجاہد کا تو مستقبل ہے میدانوں سے وابستہ

ابھی یہ چلتے چلتے دیکھ لیتے ہیں خرابوں کو
ابھی کچھ اور زنجیریں ہیں دیوانوں سے وابستہ

میں یوں رہزن کے بدلے پاسباں پر وار کرتا ہوں
مرے گھر کی تباہی ہے نگہبانوں سے وابستہ

ہماری بے قراری کو نہ چھیڑو مطمئن لوگو!
کہ تقدیرِ سکوں ہے ہم پریشانوں سے وابستہ

مورخ تیری رنگ آمیزیاں تو خوب ہیں لیکن
کہیں تاریخ ہو جائے نہ افسانوں سے وابستہ

محبت خامشی بھی، چیخ بھی، نغمہ بھی، نعرہ بھی۔
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ

حفیظؔ میرٹھی کو کون پہچانے کہ بیچارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ نہ دربانوں سے وابستہ

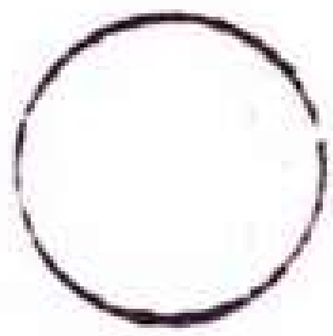

ان رہبرانِ قوم کی کیا پیروی کریں
جو رہبری کے نام پہ سوداگری کریں

نادان تو نہیں ہیں کہ یوں خودکشی کریں
ہم اور تیرے درد سے پہلو تہی کریں

ہر سمت ظلمتوں کے پرستار ہیں یہاں
شمعیں کدھر جلائیں کدھر روشنی کریں

دولت نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہے مگر
اس دشمن قرار سے کیا دوستی کریں

اے جبر آج فیصلہ کر کے اٹھیں گے ہم
جھک جائیں تیرے سامنے یا سرکشی کریں

مردانِ حق پرست کو ہر کربلا قبول
پے چیدہ مسئلہ ہو تو کچھ غور بھی کریں

خودداریوں کی جان بچانے کے واسطے
جی میں یہ آ رہی ہے کہیں خودکشی کریں

مانا کہ غم زدہ ہیں مگر بزم میں حفیظؔ
بالکل ہی چپ نہ سادھ لیں کچھ بات بھی کریں

کوئی بھی پیش نہیں آشنا مہرباں کی طرح
جہاں میں ہوں کسی ناخواندہ میہماں کی طرح

یہ بے نیاز سہارے نہ کام آئیں گے
ہمیں اٹھائے کوئی ناز دوستاں کی طرح

متاعِ آخرِ شب ہیں بچے کھچے تارے
بساطِ چرخ پڑی ہے لٹی دکاں کی طرح

یہ کس بہار بداماں چمن میں آگ لگی !
دہک رہا ہے دھواں زلفِ دلبراں کی طرح

میں اپنے دور کی روداد بربریت بھی
سنا رہا ہوں محبت کی داستاں کی طرح

ہمارا جذبۂ تعمیر دیکھ لے دنیا
سجا رہے ہیں قفس کو بھی آشیاں کی طرح

کچھ اس ادا سے چمن کا شعور جاگا ہے
کلی کلی نظر آتی ہے باغباں کی طرح

سفر کے نام سے چیں برجبیں ہے جو لوگ
وہ منزلوں پہ ملے میر کارواں کی طرح

کھنڈر نہیں ہو گیا تبدیل شاندار محل
حفیظ آپ کی مٹتی ہوئی زباں کی طرح

وہ بھی آزردہ نہ ہوں دل کی خلش بھی کم کریں
یعنی شکوہ تو کریں ان سے مگر مبہم کریں

عشق کی دنیا سے پیدا حسن کا عالم کریں
آہ کو نکہت بنائیں، اشک کو شبنم کریں

چاندنی کے ساتھ ہی تارے بھی رخصت ہو چلے
اس مناسب وقت پیمانِ وفا محکم کریں

پھر کریں تعریف ان کے منہ پہ انکے حسن کی
"بے وفا" کہہ کر یکایک پھیر انھیں برہم کریں

چل دیا جانے کدھر ہستی کی سرحد سے حفیظ
ایسے آوارہ کا ناحق آپ اتنا غم کریں

کیا جانے کیا سبب ہے کہ جی چاہتا ہے آج
روئے ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم

اب انتہائے ضبط نے دل میں لگا دی آگ
بیٹھے تھے آنسوؤں کی بغاوت دبا کے ہم

کیسا خیال، کس کی محبت، کہاں کا عشق!
یونہی جھجک گئے تھے ترے پاس آ کے ہم

سچ ہے کبھی کی رات بڑی اور کبھی کے دن
جاتے ہیں تیرے ہاتھ سے دامن چھڑا کے ہم

یہ فلسفہ بھی ہے اور دل کا فیصلہ بھی ہے
سپردگی ہی نہیں عشق میں انا بھی ہے

اگرچہ درد کی شدت سے چیختا بھی ہے
تڑپنے والے میں جینے کا حوصلہ بھی ہے

نظر سے عہد وفا لے لیا ہے جلووں نے
ادھر حجاب سمان کا معاہدہ بھی ہے

کچھ اہتمام خصوصی کی فکر کر ساقی
کہ آج رندوں میں اک رند پارسا بھی ہے

زبانِ خلق کا یوں تو کچھ اعتبار نہیں
زبانِ خلق ہی نقّارۂ خدا بھی ہے

سمجھ کے سوچ کے ہمکو خوش آمدید کہو
ہمارے ساتھ مسائل کا قافلہ بھی ہے

فقط زبان سے اقرار ہی نہیں کافی
سوال عہد وفا کے نباہ کا بھی ہے

نہ کارزارِ جہاں میں نہ خانقاہوں میں
جناب شیخ کہیں آپ کا پتہ بھی ہے

نیاز و ناز کی لذت حفیظ سے پوچھو
خدا شناس بھی ہے وہ خود آشنا بھی ہے

کھینچ کر بازار میں شہرت کے لے آیا مجھے
آہ میرا قدر داں بھی کب سمجھ پایا مجھے

جرم ہے جس پر ترس کھاتا وہ دکھیاروں میں
کیوں بلاتا ہے کسی دیوار کا سایہ مجھے

میں نے کس در پر عقیدت سے جبیں سائی نہ کی
کون سے در نے حقارت سے نہ ٹھکرایا مجھے

جرأتِ عرضِ تمنّا پر مسرت بھی ہوئی
ساتھ ہی خودداریوں پر رحم بھی آیا مجھے

یہ بھی کیا اے غمگسارو مجھ سے چھن جانے کو ہے
زندگی پر آج اتنا پیار کیوں آیا مجھے

چارہ سازی کی تو فرصت کس کو ہے لیکن حفیظ
دوستوں کا طرزِ دلجوئی پسند آیا مجھے

مکتبۂ دوام کی مطبوعات

۱	آدھی کتاب	م نسیم کے طنزیہ و مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ	ایک روپیہ
۲	صنوبروں کا شہر	سہیل زیدی کی نظموں کا مجموعہ	۲ روپے ۲۵ پیسے
۳	تگ و تاز	ابوالمجاہد زاہد کا مجموعۂ کلام	۲ روپے ۔
۴	زمزمہ	رشید کوثر فاروقی کا مجموعۂ کلام	۳ روپے ۔
۵	نقطۂ نظر	عبدالمغنی کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ	۵ روپے ۵۰ پیسے
۶	ہندوستانی تہذیب اور اردو	شبنم سبحانی، تاریخ ادب اردو کا جائزہ	۳ روپے ۵۰ پیسے
۷	اسلامی ادب	مرتبہ نجات اللہ صدیقی نظریاتی مقالات کا مجموعہ	۲ روپے ۔
۸	حدیث اقبال	طیب عثمانی کے مقالات علامہ اقبال پر	۳ روپے ۔
۹	سوز و ساز	فاروق بانسپاری کا مجموعۂ کلام	۲ روپے ۔
۱۰	اذان سحر	انور اعظمی کا مجموعۂ کلام	۷ روپے ۔
۱۱	ہوتی ہے سحر پیدا	بدنام رفیعی کا ناول	۳ روپے ۔
۱۲	ابھرتی کرنیں	مرتبہ: نجم الاسلام، افسانوں کا مجموعہ	۲ روپے ۵۰ پیسے
۱۳	نقش جنوں	سید جمال احمد امین آبادی کا مجموعۂ کلام	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
۱۴	ایک ادبی تحریک	ادارۂ ادب اسلامی ہند کا تعارف	= ۲۵ پیسے
۱۵	دستور ادارۂ ادب اسلامی ہند		= ۲۵ پیسے

مکتبۂ دوام ٹانڈہ (فیض آباد)
(یو۔پی)